

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

# اشارات

پاکستان میں عیسائیت کا سیلاب جس شوٹنگ ناک مرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے اُس کا ایک ہلکا سا اندازہ اُس مضمون سے لگایا جاسکتا ہے جو ترجمان القرآن کی دو گزشتہ اشاعتوں میں "پاکستان میں عیسائیت کی رفتار ترقی" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ اس قابل قدر مقالہ کے فاضل مرتب نے اپنے دعوے کی تائید اُن اعداد و شمار سے کی ہے جو انہیں مسیحیت کے پرچاروں نے ہی فراہم کیے ہیں۔ اس بنا پر اس مضمون کے مندرجات کو محض "سنسنی خیز" کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک ایسا ملک جسے اسلام اور صرف اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ جس کی بنیادوں میں لاتعداد معصوم بچوں

بچیوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں دفن ہوں جس کی تعمیر میں اُن گنت بے گناہوں کا خون بطور گاسے کے استعمال ہوا ہو اور جس کے حصول کے لیے مسلم قوم کی بے شمار عفتیں اور عصمتیں لٹی ہوں اور دو چار دس بیس نہیں بلکہ پورے چار کروڑ بھائی بندوں کو وحشت اور زندگی کے رحم و کرم پر چھوڑنا پڑا ہو، اسلام کے عین اس حصار کے اندر اگر کچھ دشمن ششخون مارنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس نے یا وہ چونکا دینے والی خبر اور کون سی ہو سکتی ہے۔ یہ افسوسناک صورت حال گہرے غور و فکر کی محتاج ہے اور اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے اس خطرہ کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آخر وہ مسیحی مبلغین جنہیں دو سو سال تک انگریزی امپریٹلزم کی تائید و حمایت حاصل رہی وہ اس وقت تو ناکام رہے اور اب جبکہ امپریٹلزم بیاں سے رخصت ہو چکا ہے تو اپنے ناپاک ارادوں میں وہ کامیاب ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان اسباب و وجوہ پر بھی غور کرنا چاہیے جن کی بنا پر مسلمان مسیحیت کی طرف کھینچے چلے جا رہے ہیں۔ یہ معاملہ کوئی ایسا نہیں جسے محض حادۃً سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔ حالات کے اندر اس افسوسناک تبدیلی کے کچھ وجوہ ہیں۔ وہ قوم جس نے

انگریز کی جبری اور قہاری کا پورے دو سو برس تک ٹٹ کر مقابلہ کیا اور ہر چند مطلقاً انفراد کو چھوڑ کر اس کے ہر رکن نے غیر ملکی اقتدار کے سامنے بڑی پامردی دکھائی، اُس کی صفوں میں اب آزاد ہونے کے بعد کمپوں انٹشار پیدا ہو گیا ہے۔ یہ وقت تو وہ ہے کہ پاکستان سے اسلام کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر اُن ممالک کو منور کرتی ہیں جہاں باطل کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھاتے ہوئے ہیں مگر عملی طور سے ہو یہ رہا ہے کہ اس خطہ پاک ہی میں کفر کے سایے بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتے جا رہے ہیں۔ اس غیر متوقع صورتِ حال کا تجزیہ اشد ضروری ہے۔

ہمارے نزدیک انگریزی عہدِ اقتدار میں مسیحیت کی ناکامی کے دو بڑے سبب ہیں۔ انگریز نے عیسائیت کا ٹوٹا اور حامی ہونے کے باوجود بعض سیاسی مصالح کے تحت عیسائی مشنریوں کو کام کرنے کی اتنی کھلی چھوٹ نہ دے رکھی تھی جتنی آزاد ہونے کے بعد مسلمان فرمانرواؤں نے انہیں دے دی ہے۔ خصوصاً عذر کے بعد غیر ملکی سامراج مذہب کے معاملے میں غیر معمولی حد تک محتاط ہو چکا تھا۔ اُسے اس امر کا پوری طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ مذہب کے متعلق اہل ہند اور خاص طور پر مسلمانوں کے احساسات بڑے نازک ہیں اس لیے وہ ہر ایسا قدم اٹھانے سے گھبراتا جس سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے مجروح ہونے کا خطرہ ہو۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ عیسائی مبلغین اس ملک میں جو حرکات بھی کریں گے اُس کا ذمہ دار انگریز کو ہی ٹھہرایا جائے گا۔ وہ ان کی سرگرمیوں کو نینتر کرنے کا خواہاں تو تھا اور اس راہ میں ہر قسم کی اعانت بھی کرتا مگر اس بات کا خاص خیال رکھتا کہ کہیں یہ سرگرمیاں لوگوں کو مشتعل کر کے اُس کے اقتدار کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ نہ بن جائیں۔ لہذا محض حفاظتی تدبیر کے طور پر وہ ان سرگرمیوں کو ایک خاص دائرے سے باہر نہ نکلنے دیتا تھا۔

آزاد ہونے کے بعد اب جبکہ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے تو وہ محض اس ڈر سے

کہ اُن پر تعصب اور تنگ نظری کا الزام نہ لگ جاتے ان مشنریوں کو ایسی مراعات دی گئی ہیں جو انہیں خود اپنے دورِ اقتدار میں بھی حاصل نہ تھیں۔ یہ ایک نفسیاتی عارضہ ہے جس سے ہم جتنی جلدی خلاصی پالیں اتنا ہی ہمارے جن میں مفید ہوگا۔ صرف روشن خیالی اور روادار کہلانے کے لالچ میں اگر ہم دوسروں کو اپنے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی اجازت دے دیں تو اس سے زیادہ اور کوئی قسمی حماقت ہوگی۔ رواداری بے شک بڑی پسندیدہ صفت ہے لیکن یہ اُسی صورت میں قابلِ ستائش ہے جب اس سے قومی زبیاں نہ ہوتا ہو مگر جب اس رواداری سے فائدہ اٹھا کر غیر ملکی سامراج ہماری جڑوں کو ہی اکھاڑنے کے درپے ہو جاتے اُس وقت اس بیجا واداری کا مظاہرہ کرنا شرافت نہیں بلکہ سراسر بے غیرتی ہے۔

ممکن ہے ہماری ان گزارشات کے متعلق کوئی صاحبِ یہ کہیں کہ یہ مسیحی مبلغین دوسرے غیر مسلم ممالک میں بھی تو کام کر رہے ہیں۔ اگر وہاں انہیں کوئی زیادہ خطرہ نہیں سمجھا جاتا تو مسلمانوں کے لیے یہ کیوں خطرناک ہیں۔ اس ضمن میں یہ ذہن نشین رہے کہ دنیا کی تمام آزاد قومیں ان مسیحی مشنریوں کی سرگرمیوں کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان میں جس طرح ان مبلغین کی حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی کی جا رہی ہے اُس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ ان کی "معصوم سرگرمیوں" کے متعلق کیا راتے رکھتے ہیں۔ مسیحی مشنریوں کی کارگزاریاں ہر جگہ وجہِ اضطراب ہیں کیونکہ گزشتہ تین سو برس کے افحات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ امپیریلزم اور مسیحی مشن کے درمیان چوٹی دامن کا ساتھ ہے۔ یورپین امپیریلزم نے مختلف طریقوں سے مشرقی ممالک میں نفوذ کیا ہے کہیں تو اُس نے فوج کشی کے لوگوں کو زیر کیا اور پھر ان مشنریوں کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ تعلیم کے ذریعے ان لوگوں کے قلوب کے دل و دماغ میں اس طرح کی تیدیلیاں پیدا کریں کہ وہ خود غلامی پر راضی ہو جائیں اور اُن کے اندر کبھی بھی آزادی کا احساس اُبھرنے نہ پاتے اور جب امپیریلزم کو حالات کے تحت اپنی فوجیں

ان ممالک سے ہٹانی پڑیں تو پھر یہ مشغری اور ان کے یہ بھی خواہ ان خطوں میں غیر ملکی مفادات کی حفاظت اور پاسبانی کر سکیں چنانچہ ان مشنریوں نے اپنی چالاک اور عیاری سے یورپین امپیریلزم کے لیے بعض ایسی خدمات سرانجام دی ہیں جو لشکر و سپاہ کے لیے قریب قریب ناممکن تھیں۔ کئی مقامات پر یہ مشغری ہراول دستے کے طور پر پہنچے اور سامراج کے لیے زمین مہوار کی۔ اس بنا پر ان لوگوں کی سرگرمیوں کو "خدمتِ خلق" سے تعبیر کرنا افسوسناک جہالت ہے۔ ان مسیحی مبلغین کے "محصومانہ کارناموں" کی صحیح نوعیت معلوم کرنے کے لیے آپ ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی اور ڈاکٹر عمر فروغ کی مشہور تصنیف "التبشیر والاسئحمارنی البلاد العربیہ" کا مطالعہ کریں اس سے آپ کو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ یہ لوگ تعلیم اور شفاخانوں کی آڑ میں کتنے مذہب کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ اس فاضلانہ تصنیف کے پہلے باب میں انہوں نے ناقابل تردید دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان مبلغین کی سعی و جہد کا مقصد مسیحیت کی اشاعت نہیں بلکہ استعماریت کی توسیع و ترقی ہے۔ چنانچہ ان مشنریوں میں بعض ایسے من چلے تبلیغ مذہب کے لیے دوسرے ممالک میں نکل پڑتے ہیں جو خود دوسرے سے کسی مذہب پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ یورپ کے بعض ممالک فرانس، المانیہ وغیرہ کے عیسائی مشنری خواہ اپنے حکام سے کتنے ہی نالاں ہوں مگر نوآبادیات کے معاملے میں اپنے ملک کی پالیسی سے سو فیصد متنقز رہتے ہیں۔ یہ ممالک بھی اختلاف کے باوجود ان مبلغین کی پوری پوری سرپرستی فرماتے ہیں۔ فسطائی نظام کے حامی اٹلی نے اپنے ملک میں ایک مثالی گرجا تعمیر کرایا جو استعماری سیاست کی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ روس نے جو دین اور مذہب کا سخت دشمن ہے اس نے بھی اپنے استعماری پیہچوں کو مشرقی ممالک میں گارنٹے کے لیے انہیں مسیحی مبلغین کی خدمات حاصل کیں۔ چنانچہ اس عظیم مقصد کے لیے ماسکو میں ایک مذہبی کانفرنس منعقد کرائی گئی جس میں انٹارن نے ہر نفس نصیب شرکت کی اور مسیحی مشنریوں کو اشریہ باد دیتے ہوئے انہیں دوسرے ممالک میں تبلیغ مذہب کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے ان مشنریوں کو خدا ترس لوگوں کا ایک مقدس گروہ سمجھ کر ان کی حرکات و سکنات سے صرف نظر کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔

ان لوگوں کی سرگرمیاں خصوصاً مسلم قوم کے لیے بعض دوسرے اسباب کی بنا پر بھی ویرانہ نظر آتی ہیں۔ وہ قومیں جن کی قومیت کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ رنگ، نسل یا وطن ہے ان کے لیے بعض لوگوں کا ایک مذہب کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرنا کچھ زیادہ تشویشناک نہیں ہوتا۔ اس تبدیلی سے ان کی قومیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا مگر مسلم قوم کی اپنے مذہب کے ساتھ تعلق کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔ مذہب اس قوم کے افراد کے لیے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ایک شعبہ نہیں جس کا مقصد صرف مذہبی احساسات و جذبات کی تسکین ہو یا جس کے ذریعہ لوگ ایک غیر محسوس اور غیر مرئی ذات کے ساتھ ایک طرح کا تعلق خاطر قائم کر سکیں۔ امت مسلمہ کے لیے مذہب ہی اس کا مبداء حیات اور زندگی کی اساس ہے۔ اسی سے اس کی قومیت تشکیل پاتی ہے، اور اسی کی محبت اس کے اندر زندہ رہنے کی تڑپ اور آگے بڑھنے کا دلولہ پیدا کرتی ہے۔ یہی حصار اسے دوسری قوموں کے حملوں سے محفوظ رکھتا ہے چنانچہ اس امت کے اندر مذہب کی تبدیلی بہت دُور رس نتائج کی حامل ہے یہاں جو شخص ایک مذہب کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرتا ہے۔ وہ صرف چند عقائد اور عبادت کا مارک ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنی قومیت سے بغاوت کرتا ہے اور یہاں جن لوگوں کو ایسے کام کرنے کی رعایت دی جاتی ہے یوں سمجھیے کہ انہیں ملک اور قوم کو منہدم کرنے کا لاشنس ملتا ہے۔ اس بنا پر جس طرح انگریز ہر اس فرد اور گروہ کو تشویش کی نگاہ دیکھتا ہے جو اسے انگلستان کا باغی بنا دے اور اس کی کسی حرکت کو ایک لمحہ کے لیے بھی بدداشت نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح ایک مسلمان بھی اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص یا ادارہ امت مسلمہ کے کسی فرد کو بہکا کر اسلام سے برگشتہ کرے ایک محب الوطن جو من کو بتنا اپنا ملک جرمئی عزیز ہے۔ اس سے کہیں زیادہ عزیز ایک مسلمان کے لیے اسلام ہے، یہ دین اس کے لیے نہ صرف اس دنیا میں فلاح و کامرانی کا ذریعہ ہے بلکہ اس کی اخروی نجات بھی اسی سے وابستہ ہے۔ اور وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی معاملے میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس پر کسی قسم کی آپریشن ایک سچے اور مخلص مسلمان کے لیے قیامت سے

کم نہیں۔

پھر پاکستان میں تو قومیت کی تشکیل میں سارا عمل دخل صرف اسلام کا ہے۔ دین کی بنیاد پر ہی اس ملک کو حاصل کیا گیا۔ اس کے مطالبہ کی اگر کوئی جائز اور معقول وجہ ہو سکتی تھی تو صرف یہی تھی کہ ہم اپنی مذہبی زندگی اور دنیاوی زندگی کے درمیان کوئی خط امتیاز نہیں کھینچ سکتے۔ دین ہماری زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ اس بنا پر ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم مسلمان رہتے ہوئے اپنی زندگی کے کسی حصے میں دین کو نظر انداز کر دیں۔ دین ہی ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان نشان امتیاز ہے۔

پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد اس کے مائل بہ انتشار اجزا کو اگر کوئی چیز میں میں جوڑے ہوتے ہے تو اسلام ہی ہے۔ اسلام کے علاوہ ہمارے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہو، ہم ایک نسل سے تعلق نہیں رکھتے ہمارے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہماری زبانیں ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں اور ان کے درمیان بسا اوقات اتنا اختلاف نظر آتا ہے کہ انہیں ایک سانچے میں ڈھالنا قریب قریب ناممکن ہے، سوائے اسلام کی تاریخی رعایات کے ہمارے قومی پس منظر میں بھی کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو ہمارے اندر ایک قوم ہونے کا احساس پیدا کر سکے، پھر جغرافیائی تعلق جسے قومیت کی تشکیل میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے، وہ بھی ہمارے ہاں ناپید ہے۔ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ ہے۔ اس فاصلہ کی وجہ سے دونوں خطوں کے باشندوں کے درمیان جو بعد اور دوری موجود ہے، اس سے کوئی ہوشمند انسان ناواقف نہیں۔ ان اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی جو قوت ہمیں ایک دوسرے سے مربوط رکھ رہی ہے وہ اسلام کی محبت ہے۔ آپ خود ہی غور کریں کہ اگر ہم نے اس مضافی قوت کو جس نے ہماری قوم کے مختلف بلکہ متضاد عناصر کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے، یونہی تو ادارے کے جنوں میں ضائع کر دیا

تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔

اس سلسلہ میں ہمیں اس حقیقت کو بھی پوری طرح نگاہ میں رکھنا چاہیے اگر ہم فی الواقع پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں اور اس ریاست کو دین کی خادم ریاست بنانے کے متمنی ہیں تو پھر ہمارے لیے یہ چیز اشد ضروری ہے کہ ہم عوام کے دینی اور مذہبی رجحانات کے معاملے میں انتہائی تدبیر اور تفکر کا ثبوت دیں۔ اگر ہم نے اپنی غفلت سے اپنی آئیڈیالوجی کو سب سے زیادہ حقیقت ہمارے لیے رگ جان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک غیر سنجیدہ سی چیز سمجھ کر اس کے ساتھ کھیل نماشہ کا سامنا شروع کر دیا تو پھر ہمارے ذہنوں میں ایک ایسا خوفناک انتشار پیدا ہو گا جو ہماری فخریہ نسلوں کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیگا۔ ان کے فکری جواز پھر بالکل بے ٹنگر ہو جائیں گے اور مفادات کے پھیپڑے انہیں جس طرف چاہیں گے بڑی آسانی کے ساتھ بہا کر لے جائیں گے۔ دنیا کی کوئی قوم جس کے اندر زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا جذبہ موجود ہو وہ اپنی آئیڈیالوجی کے معاملے میں اتنی بے حس اور بے پروا نہیں ہوتی جس کا ہم گزشتہ ۳ برسوں میں عملی طور پر مظاہرہ کر رہے ہیں۔ آئیڈیالوجی کا تعلق صرف دماغ سے نہیں ہوتا بلکہ جذبات و احساسات سے ہوتا ہے اور اگر کوئی قوم احساسات کے اعتبار سے ایک مرتبہ اپنے اصل موقف سے مٹ جاتے تو پھر اسے واپس لانا جان جو کھوں کا کام ہوتا ہے۔

آئیے اب ایک نظر ان اسباب پر بھی ڈال لیں جن کی وجہ سے عیسائیت کو مغربی استعمار کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کے بعد پاکستان میں فروغ ہو رہا ہے۔ یہ تحقیقت میں تاریخ کا ایک بڑا المناک سانحہ ہے کہ جو مذہب حکومت کی تائید اور حمایت کے باوجود لوگوں میں بالکل نفوذ نہ کر سکا وہ اب اقتدار کے چٹنے کے بعد عوام میں اپنی راہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہے اس کی ایک وجہ تو انگریز کی وہ سیاسی پالیسی ہے جس کی طرف ہم نے گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے

کہ غیر ملکی حکمران بعض سیاسی مصالح کی بنا پر اس چیز کو خطرناک سمجھتے تھے کہ لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتے۔ وہ جانتے تھے کہ اہل ہند کے مذہب کے معاملے میں احساسات نازک ہیں اور اگر لوگوں نے حکمرانوں کے مذہب کو قبول کرنا شروع کر دیا تو اس سے عوام کے اندر نفرت اور بغاوت کے شدید جذبات پیدا ہوں گے جو شاید ان کی سیاسی ناٹو کو ہی ڈبو دالیں۔ اس لیے وہ کھل کر عیسائیت کی سرپرستی کرنے سے برابر احتراز کرتے رہے۔ لیکن اب جبکہ سیاسی اقتدار بالکل ہٹ چکا ہے تو ان کی حکومت بالکل کھل کر مسیحی مبلغین کی حمایت کرتی ہے۔ اہل مغرب جانتے ہیں کہ یہ مشنری اپنے مقصد میں جتنے کامیاب ہوں گے اتنا ہی سامراج کو فائدہ حاصل ہوگا اور وہ اس نشہ زدگی کے خطرناک نتائج سے بھی بالکل محفوظ و مامون رہیں گے۔

پھر وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ اقتدار کے ہٹ جانے کے بعد بھی اگر پاکستان کو غلام رکھا جاسکتا ہے۔ اور اس کی اس کمزور حیثیت سے ناجائز فراڈ بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے کہ ان کے اندر اس دین کی محبت کو ختم کر دیا جائے جو بار بار انہیں غیر ملکی سامراج کے خلاف صف آرا ہونے پر آمادہ کرتا ہے اور اس کی جگہ ان کی نگاہ میں اس مذہب کو پرکشش بنایا جائے جو انہیں غلامی پر قانع کر دے اور ان کے دل و دماغ سے علیحدگی کے احساسات کو کھرچ کھرچ کر مٹا ڈالے تاکہ وہ آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنے آپ کو غلام ہی سمجھنے رہیں اور اہل یورپ اپنے اوپر استعماریت کا کوئی الزام لیے بغیر وہ سارے مقاصد حاصل کر سکیں جو سیاسی استیلا کے زمانے میں کرتے رہے تھے۔ یہ ہے وہ اصل وجہ جس کی بنا پر اہل مغرب نے ایک نئے بندھے پلان کے تحت اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز کر دیا ہے اور مستح افواج کو مٹھا کر "مکتی فوج" کے ٹڈی دل پاکستان میں اتار دیئے ہیں۔ تاکہ یہ "ہیرو" لوگوں کے ضمیر و ایمان کی بستیاں تاخت و تاراج کریں اور مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جن گوشوں میں انگریز دو سو سال تک اپنی قوت و طاقت کے باوجود نفوذ نہ کر سکا۔ انہیں مبلغین دودھ کے ڈبوں اور پھٹے پرانے کپڑوں کے ذریعہ مسخر کرنے کی کوشش کریں۔



غیر ملکی سامراج کی عیاریاں اور فتنہ سازانیاں درست سہی لیکن ہم بالکل بدویاقت ہونگے اگر ہم اپنی ان کمزوریوں کی نشاندہی نہ کریں جن کی وجہ سے ان مسیحی مبلغین کو اس بات کی ہمت ہوتی ہے کہ وہ ہمیں ایک ترنوالہ سمجھ کر چبانے کے درپے ہیں۔ باہر والوں کی فریب کاریاں ہمارا بالکل کچھ نہ بگاڑ سکتیں اگر داخلی طور پر ہم محتاط اور بیدار مغز ہوتے اور اپنے اندر ان کمزوریوں کو پرورش پانے کا قطعاً کوئی ایسا موقع نہ دیتے جن سے فائدہ اٹھا کر غیر ملکی سامراج ہمارے درپے آثار ہوا ہے۔

ہماری ان کمزوریوں میں سے بڑی کمزوری ہمارا وہ غلط قسم کا احساس رواداری ہے جو ہمارے اندر روشن خیال کہلانے کے لالچ میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے اقلیتوں کے معاملے میں ہم پر بعض ایسی نازک ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن سے عہد و براہونا ہمارا دینی فریضہ ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اس ملک میں اقلیتوں کو بالکل کھلی چھٹی دے دیں کہ وہ جو چاہیں کرتی رہیں اور کوئی ان سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ اسلام نے جہاں ہم سے اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے وہاں اس نے ان کی سرگرمیوں کی بھی کچھ حدود و قیود مقرر کی ہیں۔ ہم نے محض اس خوف سے کہ ہمیں ہم پر متعصب ہونے کا الزام نہ چپک جائے ان لوگوں کو بعض ایسی مراعات دے رکھی ہیں جو نہ تو اسلامی نقطہ نظر سے پسندیدہ ہیں اور نہ ہی دنیا کا کوئی دستور انہیں ملنی برانصاف سمجھتا ہے۔ اس بنا پر ہمارا پہلا فرض ہے کہ ہم اقلیتوں کے جان، مال، عزت و آبرو اور ان کے پرسنل لاکھوں کی توپوری مستعدی کے ساتھ حفاظت اور پاسبانی کریں لیکن انہیں اس بات کی اجازت نہ دیں کہ وہ لوگوں کو دنیاوی مال و متاع کا لالچ دے دے کہ اسلام سے برگشتہ کرتے رہیں۔

ہماری دوسری کمزوری وہ غلامانہ نقطہ نظر ہے جو ہم نے مغربی تہذیب کے متعلق قائم کر رکھا ہے۔ اس ملک کو ہم نے اسلام کے نام پر لیا تھا اس لیے یہاں کے عوام بجا طور پر اس بات کی توقع رکھتے

تھے کہ غیر ملکی سامراج کے ہٹنے کے بعد یہاں اسلامی اقدار حیات کو فروغ ہوگا، یہاں اُن بھلائیوں کی نشر و اشاعت کی جاتے گی جو اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہیں اور اُن برائیوں کا قلع ترح ہوگا جنہیں اسلام دنیا سے مٹانا چاہتا ہے۔ لوگوں کے قلب و نگاہ کے زاویے بدلیں گے اور اُن کے دل میں اسلامی تعلیمات کا احترام پیدا ہوگا۔ اس طرح یہ ملک بہت جلد ہی اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنے گا لیکن اُسے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اس مایوسی کو لوگوں کے اندر احساسِ شکست پیدا کر دیا ہے ہماری توفیق نہیں اب اسی انداز پر سوچنے لگی ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن بہر حال ہماری اپنی تہذیب سے بہتر ہے اسی لیے ہمارے اربابِ سیاست و کشاد ملک کی فلاح کے پیش نظر اس غیر ملکی تمدن کو اپنانے پر مہصر ہیں۔ چونکہ ہم نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کی غلامی کا جُڑا اپنے کندھوں سے نہیں پھینکا بلکہ اسے ایک بیش قیمت ورثہ سمجھ کر سینے سے لگائے ہوتے ہیں۔ اس لیے مغربی اقدار حیات کی عزت بھی ہماری نگاہوں میں مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مغرب کی پیروی میں دین کو اپنی زندگی میں از خود ایک ضمیمے کی حیثیت سے شامل کرنے لگے ہیں اور جو چیز ایک انسان کے لیے مبداحیات نہ ہو بلکہ محض ایک زائد سی چیز ہو اُس کی تبدیلی اُس پر قطعاً شاق نہیں گذرتی۔

اس کے علاوہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جس سرعت کے ساتھ مغربی سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے اُس میں ایک ایسے دین کا اپنانا قریب قریب ناممکن سا ہو گیا ہے جو زندگی کے ہر پہلو کے لیے ایک واضح ہدایت پیش کرتا ہو۔ اس روش سے لوگوں کے دل و دماغ میں ایک ایسی کشمکش پرورش پا رہی ہے جس نے اُن کے سارے فکری اور عملی قوی کو مضمحل کر دیا ہے۔ پاکستان کی عظیم اکثریت اس دنیا اور آخرت کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر رکھتی ہے اور یہ نقطہ نظر اُس کی ساری زندگی پر حاوی ہے لیکن وہ اپنے ارد گرد ایک ایسا ماحول پارہی ہے جو اُس کے اس بنیادی نقطہ نظر کی ہر قدم پر فراحت کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں سے چند

”مجنون“ تو کچھ دیر اس ماحول کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنے اس بنیادی نقطہ نظر کے تقاضوں کے مطابق وقت بسر کرنے کی سعی کرتے ہیں لیکن جو لوگ اس کشمکش کے لیے اپنے اندر ہمت نہیں پاتے وہ جلد ہی ایک ایسے مذہب کی تلاش شروع کر دیتے ہیں جو ان کے ضمیر اور ماحول کے درمیان مصالحت کرادے ان میں سے کچھ افراد اسلام کے اندر بعض بنیادی تبدیلیاں کر کے اس مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں اور جو ذرا مغرب پر زیادہ فریفتہ ہیں وہ اُس دین کو سرے سے خیر باد کہتے ہیں جس نے اُن کے اندر اس ذہنی کشمکش کو پیدا کر کے اُن کے ترقی کے راستوں کو مسدود کر رکھا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اہل مغرب کو ہمیں عیسائی بنانے سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی کہ ہمیں ”مہذب“ بنانے سے ہے کیونکہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ اس قوم کو ”مہذب“ بنا کر وہ اپنا خلیفہ اُتو سیدھا کر سکتے ہیں وہ عیسائی بنا کر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ امریکہ کے ایک نامور پادری اور وہاں کی ایک مشہور یونیورسٹی کے رئیس نے بڑے دانشگاہ الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا:

”ممكن ہے ہمارے مبلغین مسلمانوں کی معتد بہ تعداد کو نصرانی بنانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے ہوں لیکن انہوں نے ایک عظیم اکثریت کو مہذب ضرور بنا دیا ہے اور اب اُن کے اندر ترقی پسندی کے رجحانات بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں۔“

اسی طرح ایک دوسری تصنیف میں جس میں مسیحی مبلغین کی ناکامیوں کا جائزہ لیکر انہیں از سر نو اپنے دستے مرتب کرنے کی تلقین کی گئی ہے اُس میں نہایت زور دار الفاظ میں انہیں اس بات کا مشورہ دیا گیا ہے کہ اگر مسلمان نصرانیت قبول نہیں کرتے تو کوئی پروا نہیں تم اپنا کام جاری رکھو اور اُن کے دلوں میں اسلام کے متعلق مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرتے رہو اگر تم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو یہ تمہاری عظیم فتح ہوگی۔ تم ان لوگوں کو عیسائی بنانے بغیر ان کے عیسائیت کی ایسی خدمت لے سکو گے جو شاید خود عیسائی بھی اپنے مذہب کے لیے نہ

کر سکیں۔ اور اس غرض کے لیے اگر تمہیں مسیحی اصولوں کے اندر کچھ لچک بھی پیدا کرنی پڑے تو بلا تکلف پیدا کر دو۔

مغربی تہذیب و تمدن کے علاوہ اس ملک میں نصرانیت کو فروغ دینے والی چیز یہاں کا نظام تعلیم ہے۔ آزادی سے پہلے جو لوگ اپنے بچوں کو انگریزی مدارس میں بھیجا کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ وہ انہیں کس آگ میں جھونک رہے ہیں۔ اس لیے وہ اس کے بڑے نتائج کے تدارک کی بھی برابر فکر کرتے۔ بچے بھی اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہوتے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں جبر و اکراہ سے کر رہے ہیں اس لیے ان کے دلوں کے اندر انگریز کے لاتے ہوئے افکار و نظریات سے کوئی محبت نہ پیدا ہوتی تھی بلکہ وہ بسا اوقات ان سے شدید نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے۔

مگر اب جب کہ ملک آزاد ہو گیا ہے تو اس بوسیدہ نظام تعلیم کے بقا اور اس کے استحکام کے یہ معنی ہیں کہ ہم فی الواقع ان نظریات و افکار کو ہی صحیح سمجھتے ہیں اس لیے انہیں اپنے ملک میں اپنی دولت اور قوت کے صوف کے ساتھ فروغ دے رہے ہیں۔ ہماری یہ روش ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں مغرب کے متعلق ایک ذہنی مروجیت پیدا کر رہی ہے جس سے مسیحیت کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔

پھر اس نظام تعلیم کے مختلف شعبوں کے درمیان اتنا تضاد ہے کہ اس سے جو نوجوان خارج ہو کر نکلتے ہیں ان کے اندر فکری اعتبار سے اتنا انتشار ہوتا ہے کہ وہ کسی کلچر کی خدمت نہیں کر سکتے۔ مغربی افکار و نظریات کے ساتھ اسلامیات کا نہایت ہی بھونڈا پیوند بچوں کے ذہنوں کو سوچنے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتوں سے محروم کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ جس طرح تلاش معاش کے لیے در در کے دھکے کھاتے پھرتے ہیں بالکل اسی طرح نظری اعتبار سے مختلف کوچوں کی خاک چھانتے رہتے ہیں۔ صبح اگر وہ اشتراکیت کے حامی ہیں تو شام کو وہ

سرمایہ داری کے حق میں طلب اللسان ہونگے۔ ایک مسئلہ میں اگر اسلام اُن کے لیے پرکشش ہے تو دوسرے بیشتر مسائل میں وہ مغرب کے مقلدین ہیں۔ اُن حضرات کی ساری عمر مختلف بلکہ متضاد افکار و نظریات کا مغز تیار کرنے میں گزر جاتی ہے اور وہ قوم اور ملت کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس صورتِ حال سے بھی براہِ راست فائدہ عیسائیت کو ہی پہنچا ہے۔

ان درس گاہوں میں شاید ملت کے لیے سب سے زیادہ خطرناک وہ درس گاہیں ہیں جنہیں کانٹونٹ سکول یا یورپین ٹائپ سکول کہا جاتا ہے۔ انہیں تعلیمی ادارے کہنا ہی تعلیم کی توہین ہے، یہ فی الحقیقت اس ملک میں عیسائیت کے اڈے ہیں جہاں مسیحی مبلغین کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ان سکولوں کا پورا ماحول مغربی ہوتا ہے۔ فکر و نظر سے لے کر لباس، آداب و اطوار میں سے کوئی چیز بھی ایسی نظر نہیں آتی جس پر مغربی تہذیب و تمدن کی گہری چھاپ نہ ہو۔ اس لیے جو بچے ان قتل گاہوں سے نکلتے ہیں وہ سوائے رنگ اور نسل کے ہر لحاظ سے انگریز ہوتے ہیں۔ اُن کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز، ان کے گفتگو کرنے کا طریقہ اُن کی زبان، اُن کی نشست و برخاست، ان کا معیارِ خیر و شر، اُن کی اخلاقی اقدار اور اُن کے مشاغل العرض ان کی زندگی کا کوئی شعبہ اور اُن کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں ہوتا جن سے وہ پورے فرنگی معلوم نہ ہوتے ہوں۔ ایک ملک کے لیے اس سے بڑی بد قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جن تہذیب و تمدنوں سے قوم بیدار و مستعد رہے کہ وہ کل بڑی ہو کر اپنے دین و ملت کی خدمت کریں گی انہیں غیر ملکی سامراج کی گود میں خود ڈال دیا جائے تاکہ وہ حسبِ فتنان کے دلوں سے اسلام کے ہر احساس کو مٹا دے اور اُن کی جگہ اُن کے قلب و دماغ میں مغرب کی حداقت اور برتری کا نقش ثبت کر دے اور پھر یہ قوم اتنی احمق ہو کہ اس "روحانی ارتداد" اور ذہنی "بمغنون" کے لیے زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرنے پر راضی ہو جائے بلکہ اس "خدمتِ جلیلیہ" کو وہ اپنی بہت بڑی سعادت خیالی کرے۔

ہمارے اس ملک کے اندر جس قسم کے معاشرتی نظام کو ڈھالا جا رہا ہے، اُس کا لازمی تقاضا ہے کہ لوگ اب اپنے ذہین بچوں کو ان عیسائی مشنزوں کے سکولوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھیج کر انہیں لائڈبب بنائیں۔ یہاں سول سروس کے اندر انہیں لوگوں کی زیادہ پذیرائی ہوتی ہے جو انگریزی لہجہ میں گفتگو کرنے کے علاوہ آداب، طرز رہائش اور مشاغل میں سو فی صد انگریز ہوں۔ وہ اپنی قوم کے احساسات اور جذبات کے معاملے میں جتنا زیادہ فریگیٹ طرز عمل کا مظاہرہ کریں گے اتنا ہی اُن پر ترقی کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ اس صورتِ حال کا فطری نتیجہ یہی ہے کہ جو لوگ بھی اپنے بچوں کو اعلیٰ ملازمتوں کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں وہ انہیں اُن درسگاہوں کے حوالے کرتے ہیں۔ جہاں ان مطلوبہ صفات کو ترقی دینے اور پرورش کرنے کے زیادہ سے زیادہ بہتر انتظامات ہیں۔ اس بنا پر بھی ان عیسائی مشنزوں کو قوم کے ذہین بچوں میں کام کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو رہے ہیں اور یہ لوگ ان سے خاندانہ اٹھا کر نہ صرف انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں بلکہ انہیں ملک و ملت سے بھی کافی حد تک بیگانہ کر دیا ہے۔

مسیحیت کو جس راستے سے امت مسلمہ کے اندر غالباً سب سے زیادہ بہتر طریقے سے نفوذ کا موقع ملا ہے وہ زبان کا راستہ ہے۔ میکالے نے آغاز ہی سے اس راہ کی آسانیوں کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا وہ جانتا تھا کہ یہ وہ راستہ ہے جس سے لوگوں کو کسی وقت کے بغیر مغربی تہذیب اور اُس کے مذہب کا پرستار بنایا جاسکتا ہے اور لوگوں کے اندر اپنی اس ذہنی تہذیب کا کبھی احساس بھی پیدا نہ ہونے پائے گا۔ کسی قوم کی زبان محض اس کے افراد کے درمیان اظہار خیال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ اُس کی وساطت سے افراد کے ذہنی پس منظر تیار ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں اپنی روایات کے ساتھ گونا گوں محبت پیدا ہوتی ہے۔ انگریزی بے جان الفاظ کا ہی مجرہ نہیں بلکہ اس کے استعاروں اور اس کی تشبیہات میں انگریزی قوم کی پوری تاریخ اور روایات لپٹی پڑی ہیں۔ اس کی شاعری میں اس قوم کے مابعد الطبعی عقاید سمونے ہوئے ہیں

آپ اس زبان کا اس کے پس منظر علائق سے الگ کر کے مطالعہ نہیں کر سکتے۔ جب بھی ہم نوخیز نسلوں کو اس زبان کے ذریعہ تعلیم دیں گے تو ان کے ذہنی پس منظر میں وہی چیزیں منقش ہوں گی جو اس زبان سے وابستہ ہیں۔ اسی زبان کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے انگریزی کے ایک نہایت ہی خاضل استاد نے ارشاد فرمایا ہے۔

”جس زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اس کے بعض پس منظر علائق ہوتے ہیں جو خود بخود تعلیم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو، ارضیات ہو یا جغرافیہ، نفسیات ہو یا فلسفہ، معاشیات ہو یا تاریخ، اگر ذریعہ بیان انگریزی ہے تو جو روایات انگریزی زبان کی ہیں پس منظر میں وہ آپ سے آپ شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری ذہنیتیں نیم انگریزی یا کم از کم ۵ فیصد انگریزی تو ضرور ہوتی جا رہی ہیں۔ انگریزی کا ذریعہ تعلیم ہونا ہمارے مسلمان بننے میں حارج ہو رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ چند برس پہلے کیمبرج یونیورسٹی میں وہاں کے انگریزی کے سب سے بڑے پروفیسر نے کہا کہ کوئی شخص جو عیسائی نہیں ہے وہ انگریزی شاعری کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان کا پس منظر کچھ تو وہ ہے جسے PAGAN کہتے ہیں یعنی کافرانہ۔ ان معنوں میں کہ یونان اور روما شمالی سکند سے میویا کی روایات پر اس زبان کی بنیاد ہے اور اس نے انہیں زندہ کر رکھا ہے، انگریزی زبان کی دوسری بنیاد جس میں مذہبی روایات ہیں اور تیسری بنیاد جدید سائنٹفک روایات۔ نشاۃ ثانیہ کے وقت سے لیکر آج تک۔ یہی تینوں روایتیں انگریزی زبان کی تشکیل و ترویج کی ذمہ دار ہیں جب ہم انگریزی پڑھتے ہیں تو غیر محسوس طور پر یہ تینوں روایتیں ہمارے ذہن کو متاثر کرتی ہیں ہماری ذہنیت کو خاص ساچوں میں ڈھالتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ہمارا ذہنی پس منظر فارسی، عربی اور اردو کی روشنی میں ڈھلے خواہ ہم طبقات الارض پڑھیں خواہ جغرافیہ، چاہے تاریخ انگلستان۔ ان علوم کا اردو میں ہونا ہی ہمیں اسلامی روایات

کے قریب لائے گا۔

یہ الفاظ کسی کٹھن ملا کے نہیں جنہیں محض رحمت پسندی کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس فاضل استاد کے ہیں جو برسوں کیمبرج یونیورسٹی میں سچا اور جو قریب قریب رابع صدی سے اس ملک میں انگریزی زبان اور ادب کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اس بات کا بڑی آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام سے دُور کرنے اور مسیحیت سے قریب کرنے میں انگریزی زبان کو کتنا دخل حاصل ہے۔

یہ تو ہیں مختصر طور پر وہ بلا واسطہ اسباب جن کی بنا پر پاکستان میں نصرانیت کو ترقی کرنے کا موقع ملا ہے مگر ان اسباب کے ساتھ ساتھ کچھ بلا واسطہ وجوہ بھی شامل ہیں جن کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان اسباب میں سے سب سے پہلا سبب اہل پاکستان کی غربت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد کچھ لوگوں پر مہن برسا ہے اور وہ ان کی آن میں انتہائی دو ٹنڈ ہو گئے ہیں مگر یہ چیز بھی امر واقعہ ہے کہ یہاں کی عظیم اکثریت لاتعداد معاشی الجھنوں میں گرفتار ہے غریب طبقوں کے لیے اپنے بچوں کو حسبِ منشا تعلیم دلوانا قریب قریب ناممکن سا ہو گیا ہے۔ اس لیے بعض وہ نوجوان جو اپنی ترقی کی ساری راہیں مسدود پاتے ہیں اور ان کے اندر دین اور ایمان کی قدر بھی خارجی ماحول کی نامناسبیت کی وجہ سے کم ہو جاتی ہے وہ اعلیٰ تعلیم اور بہتر ملازمت کے لالچ میں اسلام کو ہی خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ ان مشنزویوں کی درگاہوں میں مسلمان طلباء کے ساتھ ایک ناروا امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ عیسائی طلباء کو ہر قسم کی مراعات حاصل ہوتی ہیں اور ان کے مقابلے میں مسلمان طلبہ سے بہت زیادہ رقم فیسیوں اور جرمانوں کی شکل میں وصول کی جاتی ہے

لے چراغ راہ، نظریہ پاکستان نبراز جناب پروفیسر حمید احمد خان ص ۲۲۶-۲۲۷



قریب قریب ہی حال مشن ہسپتالوں کا بھی ہے۔ عیسائی مریضوں سے ایک پیسہ لیے بغیر انہیں بہتر سے بہتر طبی امداد پہنچائی جاتی ہے اور ان کے مقابلے میں جو مسلمان ان ہسپتالوں کا رخ کرتے ہیں ان سے اس خدمتِ خلق کا اتنا بھاری معاوضہ وصول کیا جاتا ہے جس کی عام جسمیں متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان اداروں میں عیسائی اور مسلمان کے درمیان بے یقینگی سلوک ان لوگوں کے لیے جو نہ تو اسلام کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کی محبت ان کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں ہوتی ہے، ایک کڑی آزمائش اور ایک مستقل فتنہ بن گیا ہے جو انہیں کسی وقت بھی راہِ راست سے ہٹا سکتا ہے۔

پھر ڈیلائیٹ پلٹ اور امریکہ پلٹ لوگوں کو پاکستان میں ملازمت کی جو سہولتیں حاصل ہیں انہوں نے بھی عیسائیت کے فروغ میں کافی مدد دی ہے۔ "وہ من چلے" جو اگر چہ رہتے تو اس ملک میں ہیں، اسی ملک کا نمک کھاتے ہیں، اسی کی مال و دولت سے مستفید ہوتے ہیں مگر جن کا دل ہمیشہ مغرب میں اٹکار رہتا ہے۔ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت انہیں باہر بھیجنے اور وہاں تعلیم دلوانے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی اور خود ان کے اپنے وسائل اس "مہم" کے لیے ناکافی ہیں تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر عیسائی اداروں کی طرف لپک پڑتے ہیں جو انہیں فوراً اپنی آغوش میں لیکر ان کی دلی تمناؤں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ صاحبِ بہادر صرف غیر ملکی سیاست اور روشن مستقبل کے فریب میں آکر ایمان جیسی متاعِ عزیز کو داؤں پر لگا دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ فادرہ کو حکامِ عالی مقام کے ہاں جو عزت و توقیر حاصل ہوتی ہے اس کا بھی عیسائیت کے پھیلنے میں بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں کا مذہبی رہنما بیچارا آج بھی حکام کے نزدیک اتنا ہی مغلوب اور قابلِ نفرت ہے جتنا کہ انگریزی۔ جہد میں تھا۔ مگر یہ کہ اس سے جو

پر خاش تھی اس کی وجہ تو سمجھ میں آسکتی ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہی وہ ذات ہے جو اس کے ناپاک  
 عزائم کے لیے ڈائنامیٹ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے وہ اس سے جو ناروا سلوک کر رہا  
 تھا وہ اس کے استعماری مقاصد کے عین مطابقی تھا لیکن انگریز کے رخصت ہو جانے کے بعد  
 اس بیچارے کے نصیب آج تک نہیں جاگے۔ مسیحی پادری جب چاہے بلا روک ٹوک علیوں  
 کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لیے بڑے سے بڑے حاکم سے بلا تکلف ملاقات کر کے اصلاح  
 حال کے لیے تقاضا کر سکتا ہے۔ اُس کی تکلیفات اور شکایات کو حکومت کے ایوانوں میں پوری  
 توجہ سے سنا جاتا ہے اور انہیں دور کرنے کے لیے بھی تنگ و دوہ ہوتی ہے لیکن اس کے مقابلے  
 میں مسلمانوں کا مذہبی رہنما آج بھی حکومت کے نزدیک ناپسندیدہ عنصر ہے جس کی حکومت کی  
 نظر میں کوئی عزت و توقیر نہیں۔ اُس بیچارے کی کہیں کوئی شنوائی نہیں ہوتی وہ اپنے بھائی بندوں  
 کی تکلیفات سے ارباب بست و کشاد کو آگاہ کرنے سے قاصر ہے اُس کی بات پر توجہ کرنے  
 کی بجائے اُسے اکثر بد فہم استہزاؤں بنایا جاتا ہے اس بنا پر وہ مسلم معاشرے کی کوئی ایسی خدمت  
 سرانجام نہیں دے سکتا جس سے وہ لوگوں کے دل موہنے میں کامیاب ہو سکے۔ اُسے اپنے  
 گھر کے اندر ہی بے اثر اور اجنبی بنا کر رکھ دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں میں جب کبھی  
 لوگوں کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ اس کے ازالہ کے لیے "فاوڑ کی طرف نگاہ اٹھا کر  
 دیکھنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پلاتے ہیں اور "فاوڑ اپنی اس خدمت کے عوض اُن سے اُن  
 کے ضمیر اور ایمان خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور بہت سے موقعوں پر کامیاب بھی ہو جاتا  
 ہے۔